ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر محمود الحسن
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
ساجدہ سلطانہ
پی ایچ۔ڈی سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اقبال کا فلسفہ خودی اور انسان کامل

Dr. Mahmood-ul-Hassan
Assistant Professor, Urdu Department, NUML, Islamabad.
Sajida Sultana
PhD Urdu Scholar, Urdu Department, NUML, Islamabad.

Iqbal's concept of Khudi (The Self) and the Perfect Man

Allama Iqbal is considered as the great Poet, thinker, Philosopher and Politician. The topic of Iqbal's Philosophy is mankind and Purpose of his Philosophy is development of the Perfect human being. He yearns that human beings should culminate to the zenith of self esteem after covering milestones of obedience, self control and divine representation. The ongoing dissertation endeavours to know about its effect on pious man.

Keywords: *Iqbal, Darwaish Sift, Chashm e baseerat, inhemak, israr e khudi, Ramooz e bekhudi.*

علامہ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے بڑے شاعر، عظیم مفکر، فلسفی اور سیاستدان کے طور پر ہوتا ہے۔ اقبال کے فلسفے کا موضوع انسان ہے اور ان کے فلسفے کا مقصد کامل انسان کی نشوونما ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی ذاتی کوشش سے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی منزلیں طے کر کے خودی کی انتہائی بلندی تک پہنچے۔ زیر نظر مقالے میں فلسفہ خودی پر بحث کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال اور ناقدین اقبال کے نزدیک مرد مومن پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جہاں مذہب کی حکومت تھی۔ ان کے والد ایک درویش صفت انسان تھے۔ اسلام کی محبت انہیں آغوش مادری میں نصیب ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل

انھوں نے مغربی ممالک میں حاصل کی۔ اللہ نے انہیں چشم بصیرت عطا کی جس کی بدولت انھوں نے مشرق اور مغرب کی تقریباً تمام مذاہب اور فلسفیانہ مدارس کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اپنی خداداد فراست کی بدولت اسلام کی ترجمانی نئے طریقوں اور مضبوط بنیادوں پر کی۔ اس بارے میں احمد ہمدانی لکھتے ہیں:

> "علامہ اقبال ذہن رسا اور دل گداز لے کر پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی قوم کی بدحالی کو دیکھا اور اس کے اسباب دریافت کرنے میں پورے انہماک سے کام لیا۔"(۱)

اقبال کے فلسفے کا موضوع انسان ہے اور ان کے فلسفے کا مقصد کامل انسان کی نشوونما ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنے فلسفے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی انفرادی نشوونما کا ذکر اسرار خودی ہے اور اس کی اجتماعی ترقی اور ارتقا کا ذکر رموزِ بے خودی میں ہے۔

اقبال کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہو کہ وہ اپنی ذاتی کوشش سے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی منزلیں طے کر کے خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچے اور پھر اپنی تمام قوتوں کو ملت کی بہبود کے لیے وقف کر دے۔ چنانچہ علامہ نے جس نظریہ علم کی ترویج کی وہ ہمہ گیر اور عالم گیر اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ایک خطبے میں کہا:

> "ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو حضور رسالتمآب نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے مقصدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی سب کے لیے یکساں ہیں۔"(۲)

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے اور یہ "خود" سے بنا ہے۔ خود کا مطلب اپنا آپ یا میں ہے اس "خود" یا "میں" کو مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ جو شخص اپنی ذات یا "میں" کو زیادہ اہمیت دے وہ عام لوگوں کی نظر میں مغرور یا متکبر قرار پاتا ہے کیونکہ وہ اپنے مقابلے میں ہر کسی کو ہیچ سمجھتا ہے چنانچہ خود بین، خود پسند، خود غرض، خود سر، خود نما سب کا مطلب مغرور یا متکبر لیا جاتا ہے اور اسی لیے خودی سے بھی غرور، تکبر یا انانیت کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اس طرح کے فقرے وجود میں آئے کہ:

"خودی اور خدائی میں بیر ہے"

یعنی خدا کو غرور پسند نہیں۔

ہمارے حکماء نے "میں"، "خود" یا خودی کو زیادہ گہری نظروں سے دیکھا ہے اور اس کی پوشیدہ وسعتوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ بعض صوفیاء نے خود سے مراد انسانی جسم لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وجود انسان کو خدا سے جدا کرنے کا باعث ہے۔ روح خدا کا جزو تھی۔ جب اسے وجود ملا تو وہ خدا سے جدا ہو گئی اور جسم میں مُقَیّد ہو گئی۔ جسم روح کو دنیاوی آلائشوں میں ملوث کرتا ہے۔ اس لیے اس سے جس قدر جلد ممکن ہو نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ چنانچہ وجود یا خود کو خطرناک سمجھا گیا اور اس سے گریز کی تعلیم دی گئی چنانچہ ابو سعید ابوالخیر کہتے ہیں: "بامارِ سیاہ نشین وباخود منیش "خود سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس کی صحبت سے بچنا چاہیے۔ صوفیا کے اس گروہ نے خدا کو سمندر اور انسان کو قطرہ قرار دیا ہے۔ قطرے کا انجام اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سمندر میں مل کر اپنی ہستی ختم کر دے اور خود سمندر بن جائے۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

قطرے کی طرح انسان کے لیے بھی اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو ختم کر کے خدا سے جا ملے۔ چنانچہ مرنے کو وصال کہا گیا ہے کیونکہ مر کر انسان خدا سے جا ملتا ہے۔ مگر اقبال کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی تعلیمات سے متصادم ہے۔ اس لیے وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ اس سے موت کے بعد کی زندگی کا تصور باطل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان مر کر خدا سے جا ملتا ہے تو پھر اس سے حساب لینے اسے سزا یا جزا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن تو ہر انسان کو اُس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی انفرادیت برقرار رہے اور وہ اپنی یکتا ذات کے ساتھ خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ چنانچہ اقبال نے نفی وجود کی بجائے اثبات وجود کا نظریہ پیش کیا۔ خودی ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے آگاہی مفت میں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے محنت، کوشش اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال نے مسلمان قوم کو جو بے عملی کا شکار تھی، عمل پر ابھارا۔ ان کے نزدیک یقین، عمل اور محبت تعمیر خودی کے لازمی اجزا ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (۵)

انھوں نے کہا کہ اس دنیا کو چھوڑ کر غاروں اور پہاڑوں میں جانا اور وہاں ریاضت اور مجاہدہ سے خدا کو پانے کی کوشش کرنا سراسر کافری ہے۔ اپنی خودی کو مٹانے کا نظریہ کفر پر مبنی ہے۔ اسلام تو خودی کے چراغ کو روشن کرنا چاہتا ہے اور وجود کے مٹانے کے خلاف ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی(۶)

ڈاکٹر ملک حسن اختر "اطرافِ اقبال" میں لکھتے ہیں:

> "اقبال نے نفیٔ وجود کی بجائے اثباتِ وجود کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے صوفیا کے نظریات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا اور پھر اپنا فلسفہ خودی میں پیش کیا جو قرآنی مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔ سب سے پہلے خودی کا مطلب بدل دیا اور اس سے وجود مراد لینے کی بجائے روح مراد لی۔"(۷)

اقبال نے خود اور خدا کے تعلق کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ اس نے خدا کو قرآن اور خودی کو سپارہ بیان کیا ہے اور خدا کو سورج اور انسان کو ستارہ کہہ کر اپنا مطلب واضح کیا ہے۔ جس طرح سپارہ قرآن ہی کا حصہ ہے مگر اپنا وجود علیحدہ بھی رکھتا ہے اور ستارہ سورج کی روشنی سے منور ہوتا ہے مگر اس کی اپنی انفرادیت بھی بحال رہتی ہے۔ قرآن کے بغیر سپارے اور سورج کے بغیر ستارے کی ہستی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی خودی خدا یا لامحدود خودی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

تو خرشیدی و من سپارہ تو
سراپا نور م از نظارہ تو(۸)

خدا نے خودی کو پیدا کیا ہے۔ لامحدود خودی ہی محدود خودی کی خالق ہے اور اس لامحدود خودی میں بے شمار خودیاں موجود ہیں اور ہر لمحہ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان "روح اقبال" میں رقمطراز ہیں:

"انسانی خودی کی نجات یہ نہیں کہ وہ ذاتِ باری میں فنا ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے کو خالق کائنات کے ارادے کے تابع کر دے۔"(۹)

بقول اقبال:

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے پہ بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے (۱۰)

خودی کا وجود خدا سے الگ ہے اور وہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ اقبالؒ نے قرآن سے حاصل کیا ہے اور اسی لیے صوفیا کے اس خیال کو رد کر دیا کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا میں ضم ہو جائے۔ رسول اکرمؐ کا معراج انسانی عروج کی انتہا ہے مگر جب وہ خدا کے سامنے گئے تو ان کا علیحدہ وجود بر قرار تھا۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر اطراف اقبال میں لکھتے ہیں:

> "اقبال ہر پہلو سے فنا کے مسئلے کے خلاف ہیں مگر وہ صوفیا کے اس نظریے سے متفق ہیں کہ ساری کائنات غیر محدود خودی کے عمل سے تخلیق میں آئی اور غیر محدودی خودی سے خودیاں ہی تخلیق ہو سکتی ہیں اس لیے ہر چیز میں خودیاں ہیں۔" (۱۱)

اقبال خودی کو زندگی کی نکھری ہوئی صورت یا اس کے کا حسن قرار دیتے ہیں۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر!
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر!

نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر![۱۲]

اقبال کے نزدیک خودی کائنات کی ہر شے میں موجود ہے اور یہ زمانے سے لڑ کر اس کے جبر سہہ کر ترقی کی نئی راہیں کھولتی ہے اور پایان کار آدم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ خودی کی ان منزلوں کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے[۱۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودی ارتقاء کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ وہ کسی مقام پر رکتی نہیں اور اس کی مثال جوئے شیر کی سی ہے جو پہاڑوں اور ریگستانوں کو روندتی ہوئی اور راستے میں آنے والی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتی ہوئی مدام چلتی رہتی ہے اور اس کی حرکت ہی زندگی کا پیغام ہے:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام[۱۴]

علامہ اقبال کے ہاں بے عملی کی زندگی خودی کے حق میں موت کا حکم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان تمام نظریوں اور فلسفہ ہائے زندگی کی مذمت کی ہے جو بے عملی کی ترغیب دیتے ہیں۔ افلاطون کا اعیان نامشہود کا نظریہ بے عملی کی طرف راغب کرتا ہے اور تصوف کا دنیا سے گریز کا تصور بھی انسانی قویٰ کو شل کر دیتا ہے اور ان دونوں نظریوں نے مشرقی اقوام پر افیون کا اثر کیا ہے۔ اس لیے اقبال نے شدت سے ان کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> "اقبال افلاطون کے اس نظریہ وجود کا شدید مخالف ہے۔ وہ اس کو اساسی طور پر غلط قرار دیتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس نظریہ وجود کے زیر اثر زندگی سے فرار کے نظریات پیدا ہوئے ہیں جن سے انسانی زندگی ارتقا اور تخلیق سے محروم ہو گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک وجود کی حقیقت عقل نہیں عمل ہے۔ عقل عمل سے پیدا ہوتی اور اس کا آلہ کار بنتی ہے۔"(۱۵)

اقبال کے نزدیک تغیر و تبدل اور ہر وہ چیز جو زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہے، عمل سے ہی وجود میں آتی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ تجربے کا مرکز دماغ یا خودی ہے۔ اقبال تن آسانی کو عمل کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے تن آسانی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور سخت کوشی کی حمایت میں اپنے قلم کا زور صرف کر دیا ہے۔ مصائب اور تکالیف انسان کو سخت جان بنا دیتے ہیں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنا سکھاتے ہیں۔ گردش روزگار اور زمانے کے تھپیڑے انسان پر اس کی خودی کو آشکار کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

پھر کہا:

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اگر انسان آرام طلب ہو جائے تو عمل کی دولت سے محروم ہو جائے گا۔

عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد ہو اور اسے حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہیں۔ اگر بے مقصد عمل کیا جائے تو اس کا فائدہ نہ ہو گا مقصد کے بغیر عمل ناممکن ہے۔ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے

ہمارے دل میں آرزو یا خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ آرزو یا خواہش ہمیں عمل پر اکساتی ہے۔ اگر آرزو نہ ہو تو عمل وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے آرزو یا تمنا کو بھی بڑی اہمیت دی ہے۔

آرزو محبت کا جزو ہے۔ عشق بغیر آرزو کے وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ کسی کی تمنا جب تک دل کو زخمی نہ کرے عشق اس میں پیدا نہیں ہوتا۔ آرزو جب شدت اختیار کر جاتی ہے تو ہم اس کو عشق کا نام دے دیتے ہیں اور عشق کی نوعیت کا تعین آرزو ہی کرتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ صوفیا آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دیتا ہے مگر اقبال آرزو کے سوز کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے ہاں آرزو مقاصد کو تخلیق کرتی ہے اور پھر ان کی تسخیر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کا عشق غاروں میں چھپ جاتا ہے اور اقبال کا عشق ستاروں پر کمند ڈالنے کے منصوبے بناتا ہے اور پھر ان سے بھی آگے اپنی منزل تلاش کرتا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں(۱۶)

عمل کو شدت بخشنے والی سب سے بڑی قوت عشق ہے یہ عمل کو تسلسل عطا کرتی ہے اور نصب العین سے محبت سکھاتی ہے۔ عشق اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔ یوں یہ عمل کو بے خوف بنا دیتا ہے اور تمام اندیشوں کو راہ سے ہٹا دیتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

خودی کے لیے عمل، عشق، آرزو اور مقاصد ضروری ہیں۔ عمل، عشق، مقاصد اور آرزو کا آپس میں بھی گہرا تعلق ہے۔ مقاصد کے بغیر، آرزو پیدا نہیں ہوتی، آرزو عشق کی خالق ہے اور عشق عمل کا خالق ہے۔ عمل انسان کو فائدہ ضرور پہنچاتا ہے چنانچہ اقبال نے کہیں نپولین کے جوشِ کردار اور مسولینی کی ندرت فکر و عمل کی تعریف کی ہے اور کہیں اسی جوش کردار کی وجہ سے چنگیز یا تیمور کو اللہ کے نشتر قرار دیا ہے۔

اسلام نے خودی کی تعمیر کے لیے ایک نصب العین پیش کیا ہے اور وہ ہے نیابت الٰہی کا حصول۔ اقبال نے اس کے لیے پہلی بات جو ضروری قرار دی ہے وہ اطاعت ہے۔ جب تک کسی خاص آئین کی پابندی نہ کی جائے ترقی ناممکن ہے۔ آئین کی اطاعت ہی انسان میں آگے بڑھنے کی قوت پیدا کرتی ہے اور یہ آئین کیا ہے؟ خودی کی تربیت کا ذریعہ جو اسے شر نہ بننے دے بلکہ خیر میں ڈھال دے۔ اقبال کے نزدیک جب انسان اپنے مالک حقیقی کے احکامات کی بجا آوری کرتا ہے اور انھیں احسن طریقے سے بروئے کار لاتا ہے تو وہ خودی کی پہلی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے خیال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا آئین ہی اپنے اندر یہ قابلیت رکھتا ہے۔

اطاعت کے بعد ضبط نفس کی منزل ہے۔ اگر انسان اپنے آپ پر کنٹرول نہ ہو تو وہ کبھی بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے نزدیک اپنے نفس کو قابو میں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جان اور خوفِ آلامِ زمین سے نجات حاصل کرے۔ اسی طرح اسے بعض چیزوں کی محبت سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ مثلاً جب مال و دولت، حبِ وطن اور حبِ خویش و اقربا، یہ محبتیں انسان سے ایسے کام کرواتی ہیں جو خودی کے لیے مضر ہیں اور ان سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں سے مدد لینی چاہیے:

۱۔ لاالہ کی تلوار ہاتھ میں ہونی چاہیے

۲۔ نماز سے اپنے دل کو قوی کر لیا جائے۔

۳۔ روزہ کی مدد سے تن آسانی سے نجات حاصل کر لی جائے۔

۴۔ حج کی مدد سے وطن پرستی ختم کی جائے اور ہجرت کا سبق سیکھا جائے۔

۵۔ حب دولت کو زکوۃ سے ختم کیا جائے۔

یہ پانچ چیزیں انسان کے نفس کو قابو میں کرتی ہیں اور وہ نفس کے اونٹ پر سواری کے قابل ہو جاتا ہے۔ ان دو مرحلوں سے گزر کر وہ خدا کا نائب کہلاتا ہے۔ جب خودی کی نشوونما اور اس کی تربیت کے بعد انسان نیابت الٰہی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے تو وہ کائنات پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کا نائب ہے اس لیے خدا کی صفات اس میں

آجاتی ہیں۔ اقبال کا "انسان کامل" یا "مردِ مومن" اسی مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور اقبالؔ کے نزدیک یہ خودی کی اعلیٰ ترین صورت ہے اور کاروان زندگی کی یہی منزل ہے:

نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اقبال کے "انسان کامل" کے تصور کو اکثر لوگوں نے غلط سمجھا اور اس کو نطشے کے "فوق البشر" کے مماثل قرار دیا۔ حالانکہ ان دونوں کے نظریات میں بنیادی فرق ہے۔ اقبال کا "انسان کامل" اخلاق حسنہ کا نمونہ ہے جو اپنی زندگی میں اعلیٰ قدروں کی تخلیق کرتا ہے۔ جبکہ نطشے کا "فوق البشر" کسی اخلاق کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک رزم گاہ حیات میں نیکی نہیں بلکہ قوت درکار ہے تاکہ کمزوروں پر غلبہ حاصل کیا جاسکے۔ اقبال کا "انسان کامل" بلا شبہ سخت کوشی، جدوجہد اور عمل مسلسل سے اپنی خودی کی تکمیل کرتا ہے اور اس طرح عناصر فطرت پر غلبہ حاصل کرتا ہے، لیکن اس کی جدوجہد اخلاقی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ نطشے خدا کا منکر تھا۔ اس کے نزدیک انسان کی غلامانہ ذہنیت اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک خدا کے تصور کو دلوں سے نہ مٹایا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ "خدا مر گیا تاکہ فوق البشر زندہ رہے"۔ نطشے کے مذہب و اخلاق کے تصور کے خلاف اقبال کا "انسان کامل" ایمان و یقین کا عملی نمونہ ہے اور وہ اسی ایمان کی طاقت سے رزم گاہ حیات میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اقبال چاہتے ہیں کہ "انسان کامل" کی نشو و نما اس طرح ہو کہ اس کی ذات جلال و جمال کا مرقع بن جائے۔ وہ سوز و ساز زندگی کا رمز شناس ہو۔ اس کے تن محکم میں درد آشنا دل ہو یعنی وہ اشداء علی الکفار رحماء بین ھم کی عملی تصویر بن جائے۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں میں
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

وہ چاہتے ہیں کہ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسانی خودی کی بلندی جب اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ انسان کامل یا مردِ مومن جب یہ بلند مقام حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کر دیتا ہے اور یہی فلسفہ خودی کی اصل معراج ہے۔ الغرض اقبال کے فلسفہ خودی کا نچوڑ عرفان بالذات ہے اور اس کا وعظ اقبال کی زندگی کا مقصود تھا۔ آپ فلسفہ خودی کے بہت بڑے عارف تھے اور چاہتے تھے کہ امت مسلمہ اس راز کو سمجھے اور عالم اسلام ترقی کی راہوں پر گامزن ہو۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ہمدانی، اقبال فکر و فن کے آئینے میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۲۔ پروفیسر محمد عثمان، حیات اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین، مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۱

۳۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۲

۴۔ ایضاً

۵۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، طبع سوم جون ۱۹۹۶ء، ص ۸۳

۶۔ ایضاً

۷۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۹۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال، الضمر، انٹر پرائزز غزنی، سٹریٹ اردو بازار لاہور، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۱۰۔ احمد ہمدانی، اقبال فکر و فن کے آئینے میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور طبع اول، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۔ ۱۲

۱۱۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۱

۱۲۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لمیٹڈ، پبلشرز، سرکلر روڈ چوک انارکلی، لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۶ء، ص ۷۶

۱۳۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، اطراف اقبال، بزم اقبال لاہور، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۳

۱۴۔ احمد ہمدانی، اقبال فکر و فن کے آئینے میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

۱۵۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، ص ۳۳۹

۱۶۔ ملک حسن اختر، ڈاکٹر، اطراف اقبال، بزم اقبال لاہور، جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰